ڈاکٹر الیاس عشقی:

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کا مطبوعہ مقالۂ علمیہ

"حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات"

(حصۂ اوّل)

پاکستان میں بابائے قوم اور بابائے اردو کے بعد یہ لقب اس قدر عام اور ارزاں ہوگیا ہے کہ حافظ محمود شیرانی مرحوم کو بابائے تحقیق و تنقید کہنے کو جی نہیں چاہتا حالاں کہ ان کا کام اہل تحقیق و تنقید کی رہنمائی کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ ان کے کام کی وسعت و حجم کو دیکھا جائے تو وہ ایک مافوق الفطرت شخصیت نظر آتے ہیں۔ جو کام انھوں نے انجام دیا ہے وہ ایک ادارے کے ذریعہ ممکن ہوسکتا ہے۔ یہ کام انہوں نے ایک ایسے زمانے میں انجام دیا ہے جب اسی شہر اور اسی ادارے میں دو مسلّم بالشان مُحقّق و ناقد ڈاکٹر مولوی محمدؐ شفیع اور ڈاکٹر محمدؐ اقبال موجود تھے اور اپنے بلند معیار کام میں مصروف تھے۔ ان دونوں اکابر مُحقّقین کا لوہا بڑے بڑوں نے مانا لیکن موضوعات و مضامین کی وسعت، حجم اور معیار کے اعتبار سے شیرانی صاحب کا اپنا ایک مرتبہ ہے اور اگر ان کے کام کو ایک خاص ترتیب اور سلیقے سے طبع کیا جائے تو اسے ایک دائرۃ المعارف سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، اس لیے کہ اس میں اتنے مضامین اور موضوعات شامل ہیں جن کا کسی ایک محقق کے ہاں ملنا دشوار ہے۔

ان کی تصنیفات و تالیفات (مضامین و مقالات) جو شایع ہوچکے ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ ان کی مکمل تحریروں کا احاطہ نہیں کرتے۔ دانشورانہ نظم و ضبط اور تحقیقی طریق کاریوں تو ہر مُحقّق کے کام میں نظر آتا ہے مگر شیرانی صاحب کے ہاں اس میں تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔ وہ کبھی کبھی کسی مُحقّق کے کام میں نظر آتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ان کا اندازِ بیان عالمانہ ہونے کے باوجود تحقیق کو بارِ خاطر اور بوجھل نہیں ہونے دیتا۔ ان کا تبحرِ علمی، ان کی ژرف نگاہی اور تجزیاتی طرزِ عمل اس قدر بین السطور رہا ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس نہیں کرنے پاتا کہ اس تحریر کے پس منظر میں کتنا مطالعہ کتنی تحقیق اور کتنی فکر کار فرما ہے۔ پرتھوی راج راسو پر ان کی تحقیق میں تو ایک داستان کی روانی اور لطف پیدا ہوگیا ہے۔ جو بات انھیں دوسرے

محققین سے ممتاز کرتی ہے وہ اخذ نتائج کی صلاحیت ہے جو کتابی نہیں وہبی ہے۔ اور شاید تحقیق و تنقید کے لیے لازمی بھی نہیں ہے لیکن اگر ہو تو وہ تحقیق کو تخلیق بنا دیتی ہے۔ شیرانی صاحب کی تحقیق و تنقید کا بڑا حصہ اسی تعریف میں آتا ہے۔ ایک اور بات جو انھیں دوسرے محققین سے ممتاز کرتی ہے اور بہت سے محققین نے جس کی پیروی بھی کی ہے یہ ہے کہ اکثر محققین کی طرح ان کی تحقیق ایک مقالے یا مضمون پر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ وہ اپنی تحقیق پر مطمئن نہیں ہوتے تو اس پر غور و فکر کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ اور مناسب اور ضروری مواد فراہم ہوجانے کے بعد اسی موضوع پر ایک نئے انداز اور نئی معلومات کے ساتھ پھر قلم اٹھاتے ہیں اور تحقیق کو آگے بڑھاتے اور مکمل کرتے ہیں۔ تنقید شعرالعجم اس کی دلچسپ اور واضح مثال ہے۔

وہ ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئے تھے جب ہند ایرانی اور ہند یورپی زبانوں پر بہت کام ہو رہا تھا اور خود برصغیر میں ولیم جونس، میکس ملر، بیمز، گریرسن، لیٹنر جیسے ماہرین لسانیات نے کام کیا تھا یا کر رہے تھے لیکن مقامی علماء و محققین یا اس سے بے خبر تھے یا وہ ان کی دسترس سے باہر تھا۔ عربی علم اللسان کی ایک شاخ سے متاثر ہو کر خان آرزو نے تحقیق لغات پر اپنے کام کا آغاز کیا جسے وہ "فقہ اللغت" کا نام دیتے ہیں۔ ان کا یہ کام ان کی مرتبہ لغات میں نظر آتا ہے اور ان کی خصوصیت بن گیا ہے۔ ان کی تالیف مثیر اس سلسلے میں ایک سنگ میل کا حکم رکھتی ہے اور اپنی علمی تدوین کی وجہ سے وہ اپنے بعد آنے والے مستشرقین کے مقابلے میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس طرح خانِ آرزو کے ہند آریائی اور ہند ایرانی زبانوں میں لغت میں تقابلی لسانیات کے اصول پر کام کا آغاز کیا۔ بعد میں اس اصول پر اردو زبان کی ابتداء اور ارتقاء پر کام کرنے والوں نے ان کا اتباع کیا اور الفاظ کی حد تک اب بھی کر رہے ہیں۔

اردو زبان کی ابتداء اور ارتقاء کے متعلق اشارات سب سے پہلے میر امّن دہلوی کے ہاں ملتے ہیں۔ پھر نیم علمی تحقیقات کی شکل میں یہ سلسلہ آبِ حیات اور سخندان فارس تک پہنچتا ہے جن کے مُصنّف یقیناً آرزو سے متاثر ہیں۔ لیکن مولانا محمّد حسین آزاد نے اسے تحقیق کا انداز دینے کی کوشش کی ہے۔

تاریخی اور تقابلی لسانیات کے سلسلے میں اوّلین اور معتبر کتاب حافظ محمود شیرانی کی پنجاب میں اردو ہے جس میں تاریخی تقابلی لسانی اصول تنقید کے ذریعے مولانا آزاد کے اس موقف کی کامیاب تردید کی گئی ہے کہ اردو بھاشا سے پیدا ہوئی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی ہے ہر چند کہ اس میں ان کو اوّلیت کا درجہ

حاصل نہیں ہے تاہم ان سے قبل یہ بات اتنے محکم دلائل کے ساتھ علمی دنیا کے سامنے کسی نے پیش نہیں کی تھی اگرچہ شیرانی صاحب سے قبل اردو زبان کے پنجاب میں پیدا ہونے کا ذکر پہلے پہل شیر علی خاں سرخوش نے اپنے تذکرے میں کیا تھا لیکن اس دعوے کو جدید لسانی اصول پر منطقی دلائل کے ساتھ محکم بنیادوں پر شیرانی صاحب نے پیش کیا ہے۔

رہا مولانا محمد حسین آزاد کا برج بھاشا والا موقف تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی تردید شیرانی صاحب نے علمی طور پر کر دی ہے۔ مگر شیرانی صاحب ہی کی بعد کی تحقیقات کی روشنی میں اتنا کہہ دینا غلط نہ ہوگا کہ اپنے دور میں مولانا آزاد کا موقف بھی تحقیقی تھا اور اگر کوئی اور بھی اسے تحقیقی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتا تو زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ بھی مولانا آزاد کی طرح برج بھاشا ہی سے اردو زبان کا رشتہ جوڑتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو اور کھڑی بولی (؟) سے پہلے برِصغیر کے بہت بڑے حصے میں برج بھاشا ہی شاعری کی زبان تھی اور مولانا آزاد بھی چوں کہ شاعروں ہی کے ایک تذکرے کا مُقدّمہ لکھ رہے تھے اس لیے ان کا ذہن شاعری ہی کی زبان (برج بھاشا) کی طرف گیا اور یوں بھی پنجاب میں اردو کے بعد خود شیرانی صاحب نے جب اکبر آباد کے دارالخلافہ ہونے کے سلسلے میں اردو زبان پر برج کے اثرات کا ذکر کیا ہے تو کسی حد تک ہی سہی ۔ برج سے اردو کا تعلق قائم تو ہوتا ہے ۔ حالاں کہ انھوں نے پنجاب اور برج کے علاوہ دِلّی کے گرد و نواح میں ہریانہ اور راجستھان کی زبانوں کے علاوہ دکنی اور شمالی ہند کے اثرات کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس طرح جزوی طور پر مولانا آزاد کے موقف کی تائید ہوجاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مولانا آزاد کے موقف کو تسلیم کرلیا جائے۔

اردو زبان کی ابتداء اور ارتقاء کے سلسلے میں شیرانی صاحب نے کھڑی بولی کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور اس کی تائید اور بعد میں آنے والے محققین کی تردید ان کے پوتے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے علمی اور منطقی انداز میں کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ "الولدُ سِرٌّ لِابیہ" کا قول بالکل درست ہے۔

شیرانی صاحب نے اردو زبان کے سلسلے میں بعض دریافتیں اس قسم کی پیش کی ہیں جن تک ان سے قبل اور بعد میں آنے والے محققین کی نظر ہی نہیں گئی۔ اردو کے سلسلے میں برج ۔ دکن ۔ دلی کے گرد و نواح کی زبانوں شمالی ہند اور پنجاب کے اثرات کا ذکر کسی نہ کسی طرح ہوتا رہا ہے لیکن کھڑی کو نظر انداز کر کے انھوں نے دبستان ہریانہ کا ذکر کیا ہے اور اس علاقے کی شاعری اور لُغت نگاری کا ذکر کیا ہے ۔ اسی طرح پنجاب میں اردو مثنویوں اور نصابی

نظموں کا جائزہ لیا ہے ، دکنی اثرات سے بھی خاطر خواہ اعتناء کیا ہے لیکن دبستان ہریانہ کی طرح دبستان راجپوتانہ کے ضمن میں ریاست جے پور کے ضلع میں کھنڈیلہ کے قریب مہدویوں کے ایک قصبے کا ذکر کیا ہے جو ان قصبوں کے سلسلے کا ایک اہم قصبہ ہے جو مہدوی لوگ دائرے کے نام سے آباد کرتے تھے۔ ادبی دنیا اس بات سے بالکل بے خبر تھی کہ ریاست جے پور کا یہ قصبہ " دائرہ " دبستان راجپوتانہ کی اہمیت اختیار کر جائے گا۔ اس لیے عہد اکبری میں آباد ہونے والی اس آبادی کے مہدوی جو گجرات سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے اور جنھوں نے اپنے گجراتی اور دکنی ہم مذہبوں سے تعلقات قائم رکھے تھے انھوں نے اپنے مذہبی ادب کو اردو مثنویوں کی صورت میں محفوظ کرلیا تھا جو اردو کی ایک ایسی شکل ہے جس پر راجستھانی زبان کا اثر زیادہ ہے اور جو دکنی اور گجراتی (گوجری) اردو اثرات سے بھی خالی نہیں ہے اور جس پر دکنی اور گجراتی کی معرفت پنجابی اثرات بھی موجود ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب میں اردو کے بعد بھی شیرانی صاحب اردو زبان کے سلسلے میں اپنی تحقیقات برقرار رکھتے ہیں۔ وہ کہ جہاں اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے پر مُصِر ہیں وہاں اس پر شمالی ہندوستان کی زبانوں ، دکنی ، دہلی ، کے گرد و نواح کی زبانوں ہریانوی ، راجستھانی ، اور برج کے اثرات کے بھی منکر نہیں ہیں۔ گجرات اور دکن میں دہلی اور شمالی ہند سے مسلمانوں کے نقل مکانی اور لاہور اور گجرات اور اس کے بعد دہلی کے دارالخلافے میں ہونے کی وجہ سے مختلف اللسان آبادی کے اجتماعی اثرات نے اردو کو ایک بین الصوبائی زبان بنا دیا ہے اور اس کی یہ صورت اب بھی برقرار ہے۔

جہاں تک کھڑی بولی کا ذکر ہے تو اسے سُنیتی کمار چیٹرجی اور دوسرے محققین نے بڑی اہمیت دی ہے؛ بعض نے اس لیے کہ انھیں شیرانی مرحوم کے دعوے کی تردید کرنی تھی اور سُنیتی کمار چیٹرجی اور ہندی کے بعض محققین نے اسے اس لیے زبان مان لیا کہ انھوں نے کھڑی ، اور پڑی دو زبانیں فرض کرلی تھیں ، یہ ان کی ضرورت تھی اس لیے کہ اردو کی اس شکل کو جس میں سنسکرت زبان کے الفاظ زیادہ تھے انھیں علیحدہ زبان " ہندی " کے نام سے ثابت کرنی تھی جو بقول بعض محققین کے کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے مگر شیرانی صاحب کے ہاں اس بولی (کھڑی) کا ذکر نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سُہیل بخاری مرحوم نے ایک عجیب بات کہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ زبان ہمیشہ کسی مقام سے منسوب ہوتی ہے اس لیے کھڑی بھی کسی مقام سے تعلق رکھتی ہے اور وہ مقام انھوں نے کھڑ کے نام سے فرض کرلیا ہے جس کی وجہ سے اس بولی کا نام " کھڑی " بولی پڑا ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کو لکھا

تھا کہ مقام فرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آزاد کشمیر میں ایک مقام کھڑی شریف ہے جہاں مشہور پنجابی شاعر میاں محمدؒ مصنف سیف الملوک کا مزار ہے آپ کھڑی بولی کو اس سے منسوب کیوں نہیں فرماتے جب کہ اس کے قریب میرپور (آزاد کشمیر) میں شیرانی صاحب نے تقریباً ایک ہزار سال قبل ایک اردو شاعر غلام محی الدّین کا ذکر کیا ہے جس کی ایک مثنوی "گلزار فقیر" کا حوالہ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کی کتاب حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات - حصّہ اول میں بھی ہے جو حال ہی میں مجلس ترقّی ادب لاہور نے شائع کی ہے۔

یہ کتاب شائع کر کے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایک بہت اہم کام انجام دیا ہے اس لیے کہ اتنے وسیع اور بکھرے ہوئے کام کو ایک تحقیقی کام کے لیے ایک سلسلے میں جمع کر کے سیر حاصل تبصرہ کرنا - حواشی اور تعلیقات لکھنا اور تنقیدی نظر ڈالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ کام ایک طریقے سے اُن پر فرض بھی تھا جسے انھوں نے احسن طریقے پر پورا کیا ہے۔

کتاب کے پہلے حصے کے مشمولات میں حافظ محمود شیرانی کے حالات زندگی سیرت اور کردار کے علاوہ انھیں ماہر لسانیات کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ بات کتاب کی جان ہے اور ایک طریقے سے ان کی کتاب - پنجاب میں اردو - کے گرد گھومتا ہے اور اسکے متعلق مختصر طور پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ بڑے سے کام میں کہیں نہ کہیں کوئی فروگذاشت بھی رہ جاتی ہے چنانچہ پنجاب میں اردو کی ایک اہم فروگذاشت کی طرف توجہ دلانے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا۔

پنجاب میں اردو میں شیرانی صاحب نے اردو کو الف کی - اور برج کو واو کی زبان قرار دیا ہے۔ یہ ایک صوتیاتی شناخت ہے جس میں شیرانی صاحب سے سہو ہوا ہے۔اردو بے شک الف کی زبان ہے جیسا لفظ گھوڑا سے ظاہر ہے لیکن واؤ کی زبان سندھی ہے جس میں گھوڑے کو گھوڑو کہتے ہیں۔ برج واؤ کی زبان نہیں ہے بلکہ اس میں الف اور واؤ کی درمیانی آواز ہے۔

اردو میں	گھوڑا	GHORA
سندھی میں	گھوڑو	GHORO
برج میں	گھوڑؤ	GHORAU

یہاں گریئرسن سے بھی سہو ہوا ہے اس نے اسے پنجابی کا اثر بتایا ہے "A O" اور "O" کی آواز سمجھا ہے اور اسے اس طرح لکھا ہے۔ GHORAW: گویا گریئرسن نے آواز تو تقریباً برج

کی ادا کر دی ہے مگر اسے " O " کی آواز بھی کہا ہے جو غلط ہے پنجابی میں " O " کی آواز تو ہے لیکن " A W " یا " AU " کی آواز نہیں ہے۔ یہ خاص برج کی آواز ہے اور اسے لفظ " کون " کے زیر کی آواز سے ممتاز کرنا ضروری ہے کیوں کہ یہ بحث اسما سے متعلق ہے۔

اس باب میں جائزہ لسانیات ہند، گریئرسن مستشرقین اور اردو ، برج بھاشا کا اردو سے تعلق اور پنجاب میں اردو کے ناقدین ، خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔

دوسرا باب شیرانی صاحب کے تحقیقی طریق کار سے متعلق ہے اور تیسرا باب ان کے تحقیقی کارناموں سے تعلق رکھتا ہے جس میں دبستان گجرات ، دبستان دکن ، شمالی ہند میں اردو ، دبستان ، ہریانہ ، دبستان پنجاب اور دبستان راجپوتانہ تحقیق کی خاص دریافتیں ہیں جن تک اردو ادب کے کسی محقق کی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔

شیرانی صاحب کے تحقیقی کارنامے اس قدر ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا دشوار تھا مگر ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے بڑی کاوش اور لگن سے اس طرح ایک لڑی میں پرو کر پیش کیا ہے گویا وہ کوئی بہت آسان کام تھا۔ اس ضمن میں تنقید آبِ حیات اور دیوان ذوق بہت دلچسپ عنوان ہے اور شیرانی صاحب کے بعد بہتوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے مگر اعتراف کم ہی کیا ہے۔ مولانا آزاد کی کوتاہیوں کو آبِ حیات کے حوالے سے شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کل چوبیس (۲۴) عنوانات قائم کیے ہیں اس باب کا یہ حصّہ شیرانی صاحب کے بعد آبِ حیات کے ناقدین پر ختم ہوتا ہے اس کے بعد فارسی شاعری کی قدامت اور تنقید شعرا العجم ہے اس میں اہم عنوانات شامل ہیں۔ اسی طرح فردوسی کے شاہنامے پر تنقید و تحقیق ہے جس میں سولہ (۱۶) عنوانات آئے ہیں۔

آخری باب شیرانی اور تدوین متن پر ہے جس میں چھے عنوانات ہیں۔ تمہید متن کے تحت ۸ عنوانات ہیں یہ تمہید متن سے متعلق ہیں۔ پھر تالیف متن کے تحت دس عنوانات ہیں۔ آخر میں متن سے متعلق دس عنوانات ہیں۔ اس طرح یہ کتاب حافظ محمود شیرانی مرحوم کے اہم کارنامے کے ایک حصّے پر سیر حاصل بحث کرتی ہے اور ان کے کام کی اہمیت اور عظمت کو سامنے لاتی ہے۔ بلاشبہہ یہ اہل علم کے لیے ایک بیش بہا تحفہ ہے اور ان کی نظریں اس کتاب کے دوسرے حصّے پر لگی ہوئی ہیں۔